ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

زاہدہ حنا کے افسانوں کا موضوعاتی تنوّع

Topical Variation of Zahida Hina's Short Stories

روبینہ شاہین،
پی ایچ ڈی سکالر (اردو)
ڈاکٹر شگفتہ فردوس
،اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
جی سی ویمن یونی ورسٹی، سیال کوٹ

ABSTRACT

Among all Urdu short story writers, Zahida Hina has emerged as a notable one due to her topics, female characters and approach towards international burning issues. Zahida Hina's fiction introduces us to the painful and happy scenes of life. Not only history, culture and contemporary life grows in them but also modern awareness knocks on the reader's consciousness. She talks about the ground realities. Zahida Hina has covered countless topics in her fiction, including social inequalities, growing psychological issues in society, dying social traditions, objective political conditions, the horrors of globalization, Rebellion, Oppression ،Barbarism, Injustice, Society Beyond the Individual and the World Beyond Society, attempts to capture fleeting moments, atheism, the horrors of war, the grief of being uprooted, broken relationships, landlessness, cultural retrieval, realism, progressivism and feminist issues.

زاہدہ حنا اردو کی ایک نامور ادیبہ ہیں۔انہوں نے افسانہ نگاری، ناول نگاری،اور میدانِ صحافت میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔انہیں پاکستان کی سب سے کم عمر کالم نگار ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔اچھوتے موضوعات، جانے پہچانے کردار، خوبصورت منظر نگاری، جزئیات نگاری، حقیقت نگاری، سماجی وسیاسی مسائل کا بیان، مقصدیت، سادہ وشیریں زبان اور دل موہ لینے والے طرزِ تحریر کے باعث پڑھی اور پسند کی جاتی ہیں۔

زاہدہ حنا نے ہندوستان کے صوبے "بہار" کے شہر سہرام میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو آنکھ کھولی۔ان کے والد محمد ابوالخیر کو بغاوت اور شورش کے جرم میں چودہ سال کی سزا ہوئی تھی۔اس بناپر بہت کسمپرسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔جب آپ تقریباً سوا سال کی تھیں تو ان کا خاندان بھی دیگر مسلمان گھرانوں کی طرح پاکستان ہجرت کر آیا۔زاہدہ حنا نے کراچی آکر ہوش سنبھالا۔معاشی مسائل نے سکول میں داخلہ لینے کی اجازت نہ دی لہذا گھر پر ہی سوا چار سال کی عمر میں والد صاحب سے پڑھنا شروع کیا اور بہت چھوٹی عمر میں ہی والد اور والدہ کی کتابیں چھپ چھپ کر پڑھنے لگیں۔یوں ان کا بچپن تنہا کتابوں کی سنگت میں گزرا۔زاہدہ اپنے ایک انٹرویو میں اس بارے میں بتاتی ہیں:

"سوا برس کی ہوئی تو پاکستان، کراچی ہجرت کر آئے۔ مجھ سے چھوٹے ایک بھائی اور بہن تھے۔ میں ان سے چار سال بڑی تھی۔ میرا بچپن بڑا تنہا تھا۔ والد کا کہنا تھا کہ آس پاس کے لوگوں سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اشراف میں سے ہیں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

اور وہ اتنے اشراف نہیں ہیں۔ لہذا میرا وقت اپنے ساتھ گزرا اور اپنی کتابوں کے ساتھ گزرا۔ اپنی کیا، امی کی کتابیں، ابا کی کتابیں۔ میرا ایک طوطا تھا، سیڑھیوں سے اوپر جنگلے پر طوطے کے پنجرے کے نیچے بیٹھ کر میں کتابیں پڑھا کرتی تھی۔"(۱)

گھر کے ادبی ماحول نے زاہدہ حنا کو ادبی ذوق عطا کیا اور اپنی پہلی کہانی انہوں نے نو برس کی عمر میں لکھی۔ اس کہانی کا ہیرو ان کے چچا کا ہم نام تھا۔ جب اُن کی سہیلی (جو عمر میں کچھ بڑی تھی) نے وہ کہانی پڑھی تو زاہدہ سے کہا کہ اسے پھاڑ دو ورنہ والدین سے تمہاری پٹائی ہو جائے گی۔ یوں وہ کہانی ضائع کر دی گئی۔ ان کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ساتویں جماعت میں ہیپی ہوم سکول میں داخلے سے ہوا، انہوں نے یونیورسٹی آف کراچی سے بی۔ اے کیا۔ ان کی پہلی تحریر ۱۹۵۹ء میں سکول میگزین "ارم" میں اور پہلا مضمون ۱۹۶۲ میں "انشا" میں شائع ہوا۔ پہلا افسانہ ۱۹۶۴ء میں "ہم قلم" کراچی میں چھپا۔ وہ پاکستان کی صحافت میں سب سے کم عمر کالم نگار ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہیں۔ وہ روزنامہ "جنگ" سے ۱۹۸۸ء تا ۲۰۰۵ء وابستہ رہیں۔ روزنامہ "مشرق"، ہفتہ وار "اخبار خواتین" اور "عالمی ڈائجسٹ" سے منسلک رہیں۔ انہوں نے بی بی سی اردو سروس میں بطور پروگرام پروڈیوسر کام کیا اور وائس آف امریکہ اردو سروس میں بطور مضمون نگار اور پروگرام پروڈیوسر خدمات انجام دیں۔ آج کل وہ ''روشن خیال" کی مدیرہ ہیں اور "ایکسپریس"، "اردو نیوز" جدہ اور سندھی اخبار، روزنامہ "عسرت" کے لیے ہفتہ وار کالم تحریر کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں بھارت کے مقبول ترین ہندی اخبار "دینیک بھاسکر" کے سنڈے میگزین "رس رنگ" میں ۲۰۰۶ء سے ہفتہ وار کالم "پاکستان ڈائری" بھی لکھ رہی ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر طویل دورانیے کے ان کے لکھے ہوئے بہت سے ڈرامے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کا ایک ناولٹ "نہ جنوں رہا نہ پری رہی" ہندی، سندھی اور انگریزی میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے اردو افسانوں کے تین مجموعے "قیدی سانس لیتا ہے"" "، راہ میں اجل ہے"، "رقص بسمل"، دو ناول "درد کا شجر"، "دردِ آشوب"، ایک مضامین کا مجموعہ "عورت زندگی کا زنداں" اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ان کی کتاب "وہ چہچہاتی بلبلیں جانے گئی کہاں" جو آٹھ مرحوم ادیباؤں کے بارے میں ہے، ابھی زیر طبع ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی خود نوشت بھی تحریر کر رہی ہیں۔ ان کے چودہ افسانوں کا انگریزی ترجمہ "The House of Loneliness" بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ان کے اردو افسانے سندھی، مراٹھی، بنگلہ، گرمکھی، مدبالی، کرٹلی، ہندی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں، یہ تراجم فیض احمد فیض، امرتا پریتم، جے رتن، پروفیسر سی ایم نعیم، پروفیسر عمر میمن، انور عنایت اللہ اور ثمینہ رحمان نے کیے ہیں۔

زاہدہ حنا کی ادبی خدمات کی بنا پر ساغر صدیقی ادبی ایوارڈ، جشنِ فیض ایوارڈ، لٹریری پرفارمنس انعام، کے پی انعام، سندھ سپیکر انعام، سارک لٹریری ایوارڈ ۲۰۰۱ء میں (صدرِ بھارت سے) مل چکے ہیں۔ اگست ۲۰۰۶ء میں انہیں سب سے بڑے ادبی انعام پرائڈ آف پرفارمینس کا حق دار ٹھرایا گیا مگر انہوں نے ملٹری گورنمنٹ کے خلاف بطور احتجاج انکار کر دیا کہ جس صدر کے خلاف میں ۱۹۹۹ء سے لکھ رہی ہوں اس سے انعام کیسے لے سکتی ہوں۔ زاہدہ حنا ۱۹۷۰ء میں مشہور شاعر جون ایلیا سے رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئیں۔ جن سے ان کی تین اولادیں، ایک بیٹا سید زریون ایلیا اور دو بیٹیاں فینینہ اور سوہینہ ہیں۔ ان کی شادی طبیعتوں کے اختلاف کے سبب قائم نہ رہ سکی اور ۱۹۷۹ء میں دونوں میں علاحدگی ہو گئی۔

زاہدہ حنا جدید اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کی شہرت ان کے افسانے "زیتون کی شاخ" کے سبب ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "قیدی سانس لیتا ہے" جو مکتبہ دانیال، کراچی سے ۱۹۸۳ء سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل تیرہ افسانے بعنوان، تا کجا آباد، زیتون کی ایک شاخ، صر صرِ بے اماں کے ساتھ، آنکھوں کے دید بان، پانیوں میں سراب، شیریں چشموں کی تلاش، جل ہے سارا جال، ساتویں رات، زرد ہوائیں زرد آوازیں، بود نبود کا آشوب، ابنِ ایوب کا خواب، رنگ تمام خوں شدہ، تتلیاں ڈھونڈنے والی، شامل ہیں۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "راہ میں اجل ہے" مکتبہ دانیال کراچی سے ستمبر ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا اس میں چھ افسانے بعنوان، زمیں آگ کی آسماں آگ کا، یکے بود یک نہ بود، تتلیاں ڈھونڈنے والی، جسم و زباں کی موت سے پہلے، تنہائی کے مکاں میں، آخری بوند کی خوشبو شامل ہیں۔ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ "رقصِ بسمل" الحمد پبلشر، لاہور سے 2011ء میں طبع ہوا اور یہ بارہ افسانوں، رقصِ مقابر، معدوم ابنِ معدوم، آنکھوں کو رکھ کے طاق میں دیکھا کرے کوئی، نیند کا زرد لباس، تقدیر کے زندانی، ہر سو رقصِ بسمل بود، رانا سلیم سنگھ، جاگے ہیں خواب میں، پانیوں پر بہتی پناہ، تنہائی کا چاہِ بابل، منزل ہے کہاں تیری، کم کم بہت آرام سے ہے، پر مشتمل ہے۔

زاہدہ حنا کے افسانے ہمیں انسانی حیات کے دکھ سکھ کی آگاہی دیتے ہیں۔ ان میں نہ صرف تاریخی، ثقافتی اور عصری زندگی کی جھلک نظر آتی ہے بل کہ عصری آگہی بھی قاری کے درِ شعور پر دستک دیتی ہے۔ وہ زمینی حقائق کی بات کرتی ہیں۔ ان کے افسانے تفہیمِ زندگی کا کردار خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں۔ زاہدہ حنا نے سماجی ناہمواریوں، فرد کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

نفسیاتی مسائل، دم توڑتی سماجی روایات، معروضی سیاسی حالات اور گلوبلائزیشن کی قباحتوں جیسے لاتعداد موضوعات کو اپنے افسانوں میں پرو دیا ہے۔ تقسیمِ ہند، ہجرت، بغاوت، ظلم و بربریت، ناانصافی، فرد، معاشرہ، قوم، بینالاقوامی دنیا، اکیلاپن، مفارقت، علیحدگی، اجنبیت، لاتعلقی، کرب، اضطراب، تلاشِ ذات، مایوسی، جدید صنعتی ترقی، لادینیت، جنگ کی ہولناکیاں، اپنی جڑ سے محرومی کا غم، شکستہ رشتے ناطے، بے زمینی، تہذیب و ثقافت سے محرومی، حقیقت پسندی، ترقی پسندی اور عورت سے جڑے مدعے پر ان کے قلم کی جولانیاں عروج پر ہیں۔

بغاوت زاہدہ حنا کی طبیعت میں بچپن ہی سے رچی بسی تھی اور چھ سات برس کی عمر میں اس کے اظہار کا آغاز ہو گیا تھا۔ تاہم اس بغاوت کی جڑیں ان کی بنیاد سے جڑی ہیں۔ ان کے ایک بزرگ مرزا دلدار بیگ کو بغاوت کے جرم میں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے پھانسی دی تھی جو اب دریائے جہلم کے کنارے آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے ایک اور بزرگ مرزا عبدالستار بیگ سہسرامی نے پندرہ سو صفحات اور تین جلدوں پر مشتمل تذکرہ صوفیہ "مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین" لکھا۔ ان کے والد کو بھی چودہ سال قیدِ با مشقت کی سزا ہوئی جو رہائی کے بعد بن باسی ہو گئے۔ اپنی بغاوت اور انحراف کے ضمن میں زاہدہ حنا خود رقم طراز ہیں:

> "میں خوشحال گھرانے کے پریشان روزگار بیٹے، بے آرام باغی اور ناکام آئیڈیلسٹ کی بیٹی ہوں، بغاوت اور انحراف میری نہاد بنیاد میں ہے۔ ابتدا سے اب تک زندگی روشِ عام سے ہٹ کر گزری ہے۔ لڑکیاں جس عمر میں گڑیاں کھیلتی ہیں میں اس عمر میں اردو اور فارسی کا کلاسیکی ادب پڑھ رہی تھی۔ میرے گرو، میرے استاد، مجھے بنانے والے، مجھے بگاڑنے والے میرے باپ تھے۔(۲)

گزرتے وقت کے ساتھ زاہدہ حنا کی بغاوت کے مختلف رنگ ان کے افسانوں کی صورت ظاہر ہوتے رہے۔ سماجی ناہمواری، سیاسی عدم استحکام اور آمریت نے اُن کے اس جنون کو مزید ہوا دی اور انہیں سوشلزم اور کمیونزم کی طرف بہا لے گئی جہاں بغاوت ہی بغاوت تھی۔ اس کے باوجود وہ محبت کرتی ہیں کیونکہ وہ عورت ہیں۔ وہ کہانیاں لکھتی ہیں کہ بہادر ہیں۔ درحقیقت وہ کبھی ختم نہ ہونے والے سفر میں ہیں اور یہ سفر اختیار اور انتخاب کا سفر ہے۔ "قیدی سانس لیتا ہے" کے پیش لفظ میں وہ خود رقم طراز ہیں:

> "عورت ہونا، کہانیاں لکھنا، اختلاف کرنا، یہ ہمارے معاشرے کی تین خرابیاں ہیں اور میں ان کا ہی مجموعہ ہوں۔ اسی لیے بہت کج مج ہوں، بہت بے ڈھب ہوں، میری لکھی ہوئی کہانیاں بھی اتنی ہی کج مج اور بے ڈھب ہیں، مجھے اپنے بارے میں نہ کوئی خوش فہمی ہے اور نہ کوئی دعویٰ ہے۔ جیسے سوئی کی ناک سے گوشت میں اتری ہوئی پھانس نکالی جاتی ہے اور پھر سکھ کا سانس لیا جاتا ہے ویسے ہی میں نے اپنے ضمیر اور شعور میں چبھی ہوئی پھانسوں کو قلم کی نوک سے نکالا ہے اور ورق پر رکھ دیا ہے۔ اب اگر یہ آپ کو چبھنے لگیں تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔"(۳)

زاہدہ حنا کی کہانیوں کو ان کی ذاتی زندگی سے جدا نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتی ہیں ان کی زندگی کے تجربات ہیں اور یہ تجربات حقیقتوں پر، صداقتوں پر، ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے پر مبنی ہیں۔ ان کے شخصی اوصاف، مشاہدات، حسی تجربات، مطالعے کے موضوعات انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ ان کی جداگانہ اور منفرد روش کے پس منظر میں ان کے بچپن کا دینی و ثقافتی ماحول، لڑکپن کی حسرتیں اور مسرتیں، جوانی کے طلسمات، ازدواجی زندگی کے الم و نشاط اور معاشی و معاشرتی جبر و صبر کارفرما ہیں۔ ان کی شخصیت کے تشکیلی عناصر ہی ان کی کہانیوں کی بُنت کے عوامل ہیں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے "قیدی سانس لیتا ہے" کی تیرہ کہانیاں حسن و عشق اور رومانیت کی داستان نہیں بلکہ گھمبیر سماجی مسائل کی ترجمان ہیں۔ تنہائی کا کرب، ذات کا مسئلہ، وجود کو کھونے کا احساس، جڑ سے اکھڑنے کا غم ان کی کہانیوں میں جابجا بکھرا ہوا ہے۔ تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں خارجی حقیقت نگاری کا فقدان ہو گیا ہے اور وہ یکسر حقائق سے خالی ہیں۔ ذات کا مسئلہ بھی ایک حقیقت ہے اور تنہائی کا کرب بھی اور یہ نئی حقیقت نگاری داخلی ہو کر بھی خارجی حقیقت نگاری کا وصف رکھتی ہے۔ "ناکجا آباد" میں زاہدہ حنا نے اپنی زمین سے اکھڑنے اور اس کے نتیجے میں ذات میں سرایت کرنے والی تنہائی کی انفرادی واردات کو اجتماعی تجربے کا روپ دے دیا ہے:

> "صحرا ئیں میری بانہوں کی مانند خالی اور ویران ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان کا سوناپن اور اداسی مجھے یاد دلاتی ہے کہ یہ جگہ میرے گھر سے کس قدر مشابہ ہے۔ اپنی تعمیر میں نہیں، اپنی تنہائی اور ویرانی میں۔"(۴)

"گھر ویران، قبریں تنہا اور ان میں سونے والے بے آرام، یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوا کہ دیو زاد اجداد نے بونے جانشینوں کو جنم دیا اور ان بونے جانشینوں کی اولاد وہ لوگ ہیں جو یہاں ہر شام شور مچاتے ہیں اور محض بے کار باتیں کرتے ہیں۔ یہ سب کتنے خوش اور کس قدر آباد ہیں، میں یہاں ان سب لوگوں کی موجودگی کے باوجود تنہا ہوں، صرف ایک لمس ایسا ہے جو میرے سر اور پشت پر تھرتھراتا ہے اور میرا احساس تنہائی چند ساعتوں کے لیے معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ بوڑھا لمس اس شام کتنا جوان تھا جب اس نے مجھے میرے کل سے جدا کیا تھا اور میں اس کی جدائی کا نوحہ نہ پڑھ سکی تھی، ماتم نہ کر سکی تھی۔"(۵)

"یہ اس سے اور اس کے شاندار ماضی سے کٹے ہوئے لوگ ہیں، کٹی ہوئی پتنگیں۔"(۶)

زاہدہ حنا نے عورت سے جڑے مدعے اپنی تحریروں کا موضوع بنائے ہیں۔ وہ عورت کو گھر، خاندان اور سماج میں اپنے آزاد اور ترقی پسند تصورات کے مطابق مخصوص مقام پر دیکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں فقط عورتوں کے مسائل ہی بیان نہیں کیے بلکہ یہ بتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ ان کی پستی اور ذلت کا سبب دراصل ان کا معاشی اعتبار سے مرد پر تکیہ کرنا ہے۔ عورت اپنا ہی نہیں مرد کی طرح پورے کنبے کا پیٹ پال سکتی ہے مگر عورت کو محض کمائی کی دہلیز پر کھڑا ہونے کی قابل بنانا ہی اس کے مسائل کا حل نہیں۔ اس کے مسائل کا سب سے بڑا حل اسے سماج میں ایک ذمہ دار، باعزت فرد کی حیثیت دینا اور دلوانا ہے۔ خود عورت کو اپنی انفرادیت اور اپنے مقام کو سمجھنے کے قابل بنانا ہے اور اس کے بنیادی نسوانی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے۔ ان کی ایک کتاب "عورت زندگی کا زنداں" جو مختلف کانفرنسوں میں پڑھے آٹھ مضامین کا مجموعہ ہے، عورت پر ہونے والی سماجی، سیاسی اور معاشی زیادتیوں کا بیان ہے۔ ان کا ایک مضمون "رُشندری، رقیہ اور رشیدہ" تعلیم یافتہ اور قابل عورتوں کے مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ رشندری دیوی نے ۱۹۰۰ء صدی کے آخر میں "امر جیون" بنگالی میں لکھی۔ رقیہ سخاوت حسین نے اپنی پہلی کہانی ۱۹۰۵ء میں انگریزی میں "Sultana's Dream" کے نام سے تحریر کی جس کا اردو ترجمہ "سلطانہ کا خواب" کے نام سے کیا گیا۔ رشیدۃ النساء جو نامی گرامی تعلیم یافتہ خاندان کی بیٹی تھیں، نے اپنا پہلا ناول "اصلاح النساء" لکھا جو گیارہ سال صندوق میں رکھا رہا۔ انہوں نے اخباری دنیا میں لڑکیوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں اور سیاسی زندگی میں پیش آئندہ مشکلات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ایک مضمون "زبان کے زخم" میں مردوں کی جانب سے عورتوں کو پہنچائے گئے زبان کے گھاؤ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے استحصال کے خلاف بآوازِ بلند احتجاج کیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"ان پر دباؤ ڈالا جانے لگا وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں۔ عدالت کو اپنا فیصلہ واپس لینے کی درخواست دیں۔ جیتی ہوئی جنگ ہار جائیں۔ وہ ڈٹی رہیں۔ نہ اپنے لیے اور نہ ان چند روپوں کے لیے جو عدالت عظمیٰ نے انہیں دلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ لڑ رہی تھیں تمام مسلمان عورتوں اور تمام مسلمان لڑکیوں کے لیے۔"(۷)

"ہندوستان کے نادار مسلمان گھرانے عربوں کی حرم سرا بن گئے تھے۔ سال کے سال وہ گاڑیاں بدلتے اور بیویاں بھی۔ اپنی اندھی دھندلی آنکھوں سے انہوں نے کتنی ہی خبریں ان مظلوم لڑکیوں کی پڑھی تھیں جو حیدرآباد، پونا، بمبئی اور دلی میں چند ہزار کے مہر کے عوض چند دنوں یا چند ہفتوں کے لیے عرب شیوخ کی دلہن بنیں اور پھر ہاتھ میں طلاق نامہ اور گود میں نوزائیدہ بچے اٹھائے بازاروں میں بیٹھیں۔ مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی۔۔۔۔ یہ نظم انہوں نے ریڈیو سے سنی تھی۔ ان خبروں کو پڑھ کر انہیں یہ نظم یاد آتی۔ وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں اسے گنگناتیں اور زار زار روتیں۔ پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی۔"(۸)

"دروازہ کھلا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنگن رب المسلمین کے ماننے والوں سے بھر گیا۔ ان کے گرد کیسے کیسے علمائے کرام اور مفتیان عظام کا ہجوم تھا، سیاہ اچکنیں، عطر سے مہکتے ہوئے وسمہ لگی داڑھیاں، آنکھوں میں سرمے کا خاشیہ، سروں پر رام پوری ٹوپیاں چنی ہوئی دوپلیاں۔ انہوں نے ایک نظر اس سبزی مائل کاغذ پر ڈالی جس پر ان کے دستخط کفر و اسلام کی اس جنگ کے خاتمے کا اعلان کرنے والے تھے جس نے سارے ملک کو بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کاغذ پر لکھی ہوئی

تحریروں کی روسے وہ ان مومنین کے سامنے اپنے اس حق سے دستبردار ہورہی تھیں جو مشرکین پر مشتمل عدالت عظمیٰ نے انہیں دلایا تھا۔"(۹)

پدر سری معاشرے میں مرد کس طرح عورت کو کم تر خیال کرتا آیا ہے اور اس کو اپنا دست نگر سمجھتے ہوئے اسے ایک کنیز اور لونڈی کی حیثیت دیتا آیا ہے، زاہدہ حنا نے اپنے افسانوں میں اس مدعے کو بھی خوبصورتی سے صفحہ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔ بالخصوص عربوں کے لیے پاکستانی معاشرے میں ایک عقیدہ رواج پا گیا تھا کہ عرب نہ صرف دینی لحاظ سے امام ہیں بلکہ وہ ان کے رازق اور پالن ہار بھی ہیں اور ان کی مہربانیوں کے سلسلے دراز کرنے کے لیے اپنی عورتوں کو ان کے حرم کی زینت بنانا ضروری ہے۔ زاہدہ حنا کا افسانہ "جل ہے سارا جال" اس صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے:

> "ارم کو شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ کسی عرب شہزادے کی بیوی بننا کوئی ہنسی ٹھٹھول نہیں۔ وہ اس کی منکوحہ تھی اور عرب شاہزادے کے بقول وہ اس کی کھیتی تھی اور کھیتی اس بات کی مجاز نہیں کہ وہ ہل چلانے والے کو اس بات پر ٹوکے کہ ہل کھیتی کے آغاز سے چلایا جائے یا اختتام سے۔"(۱۰)

زاہدہ حنا نے اپنے افسانوں میں مشترکہ ارضی تہذیب کو بھی موضوع بنایا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ملک تو تقسیم ہو کر دو ہو گئے لیکن اپنا ماضی کاٹ کر نہ پھینک سکے، اپنی شاندار روایات کو نہ بھلا سکے جو دھرتی دو ٹکڑے ہونے کے سبب وہیں رہ گئیں کیونکہ وہ دھرتی کا حصّہ تھیں۔ بہت سے مہاجرین کے ساتھ ساتھ ہمارے کئی دانشوروں کا بھی یہی نقطہ نظر رہا ہے کہ تاج محل، لال قلعہ، قطب صاحب کی لاٹھ اور غالبؔ و میرؔ جتنے سرحد کے اس پار والوں کے ہیں اتنے ہمارے بھی ہیں۔ تاہم زاہدہ حنا نے ان سے ایک قدم آگے بڑھ کر اشوک کے کتبوں اور نالندہ کے کھنڈرات پر بھی اپنا حق جتایا ہے۔ "زیتون کی شاخ" میں وہ ایک امریکی تاریخ دان ایڈ گر ہومن سے مخاطب ہو کر کیا کہتی ہیں، ملاحظہ کیجیے:

> "تاج محل جس پر تم امریکی جان دیتے ہو وہ ہم نے بنایا۔ غالب جس کی شاعرانہ عظمت کے ڈنکے ان دنوں انگلستان میں پٹتے ہیں وہ ہمارا تھا، ہم میں سے تھا۔ اشوک کے کتبے اور نالندہ کے کھنڈرات جتنے ان کے تھے اتنے ہی ہمارے بھی تھے۔ سب کچھ ہمارا اور ان کا مشترک سرمایہ تھا، تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی، تم نے ہماری صرف تاریخ پڑھی ہے، ہمارا ادب نہیں پڑھا۔"(۱۱)

انسان کی شناخت اس کے ماضی کی حسین یادداشت میں زندہ رہتی ہے۔ ماضی کبھی جدا نہیں ہوتا بلکہ عصرِ حاضر میں ایک حسین روایت کی صورت ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ آدمی جب تک اپنی روایت سے جڑا رہتا ہے اس کی پہچان برقرار رہتی ہے۔ وہ جو کچھ گزرے ہوئے کل میں تھا، آج کا حصّہ بن کر آنے والے کل کی طرف گامزن ہے تو تیز رفتار وقت کی دھول یاد کے آبگینوں سے اس کی پہچان کے عکس دھندلا نہیں سکتی مگر جب آدمی اپنے کل سے کٹ جاتا ہے تو وقت کی گرد سے یاد کے حروف دھندلانے لگتے ہیں۔ اور آدمی اپنی شناخت کو کھونے لگتا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت کے بچھڑنے کے المیے کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ زاہدہ حنا نے کس شدت سے اس دکھ کو محسوس کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

> "اور تب یاد کی انگلیاں وقت کی بند مٹھی میں پھڑ پھڑاتے ہوئے لمحوں کے ان پرندوں کو محسوس کرنا چاہتی ہیں جو موجود کی شاخ سے اڑے اور ناموجود کی طرف پرواز کر گئے۔ لمحوں کے یہ پرندے وقت کی بند مٹھی میں تڑپتے ہیں اور اب یہ کبھی مائل بہ پرواز نہ ہوں گے لیکن یاد کی انگلیاں ان کے وجود کی گرمی اور خوشبو اور ان کے بدن کی کپکپاہٹ کو محسوس کرنا چاہتی ہیں۔ یاد کے ہونٹ ان ناموجود پرندوں کے بدن پر اپنے ہونٹ رکھنا چاہتے ہیں۔"(۱۲)

زاہدہ حنا کے افسانے قاری پر منکشف کرتے ہیں کہ مذہب، تاریخ، ادب اور اساطیر پر ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ یہ ان کی وسعت مطالعہ کا کمال ہے جو ان کے فنی کمال کا جزو لاینفک بن کر نمودار ہوا ہے۔ بنابریں ان کے افسانوں میں جب ان رموز و نکات کا بیان ہوتا ہے تو قاری ان کی مخصوص افسانوی فضا کا اسیر ہو کر تخلیق کی وادی میں لکھاری کا ہم سفر بن جاتا ہے۔ ان کے افسانوں "زیتون کی ایک شاخ"، "صر صر بے اماں"، "آنکھوں کے دیدبان"، اور "یکے بود، یکے نبود" میں اساطیری عناصر پائے جاتے ہیں:

"شاہ پور کو بیٹا بنا کر میں اپنے سارے شوق پورے کر سکتا ہوں۔ تم یقین کرو وہ گندھی ہوئی مٹی پر جادو کر سکتا ہے۔"(۱۳)

"حجرہ ذات کے فرش پر لمحوں کا ایندھن دہک رہا ہے اور اس کا پر تو وجود کی دیواروں پر عجب سریّت آمیز نقوش بناتا اور بگاڑتا ہے۔ دھوئیں کی چادر ہے اور اس پر مدھم سی روشنی کی تحریر ہے۔ روشنی کی یہ تحریر ان شکلوں کو واضح کرتی ہے جو اس گنبد نما چھت میں آویزاں ہیں۔ ان شکلوں کو پہننے والوں میں سے کچھ الٹے لٹک رہے ہیں اور کچھ سیدھے، کچھ نے فرشتوں سے پر مستعار لیے ہیں اور طاقت پرواز کی تلاش میں ہیں اور ہاں وہاں بعض دراز داڑھیوں والے بھی ہیں جو اپنے ہاتھوں میں دانائی کے موتی لیے بیٹھے ہیں اور انہیں لوح گل پر ٹانکتے چلے جاتے ہیں. لمحوں کے دہکتے ہوئے ایندھن کا پر تو ان شکلوں کو بھی اجاگر کرتا ہے اور کبھی تمام مناظر دھندلا جاتے ہیں لیکن خداوند کا وجود ان سب سے الگ ہے، ہر منظر سے جدا۔ اس لمحے مجھے یونانی یاد آتے ہیں کہ وہ مجھ سے اور میرے لوگوں سے زیادہ خدا دوست تھے۔ وہ اپنے دیوتاؤں اور اپنی دیویوں کو اپنی ہی خامیوں اور اپنی ہی خوبیوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے اور انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔"(۱۴)

زاہدہ حنا کے ہاں تاریخ و اساطیر کا یہ شوق و ادراک نہ صرف کہانی کو مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے بلکہ کہانی کو لمحہ بہ لمحہ آگے بھی بڑھاتا ہے۔ ان کے اساطیری ادراک کی جڑیں ماضی کے شعور سے وابسطہ ہیں جو روح اثر کی فضا میں تحلیل ہو کر تصوّف کے رنگوں کی صورت بکھر جاتا ہے۔ یہ رنگِ تصّوف ان کے لہجے کو قوت اور تیقن عطا کرتا ہے۔ ان کی تحریر سے اس رنگ کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے:

"عنکبوتِ وقت کا جالا کائنات کے گرد بُنا گیا اور ہم اس تارِ عنکبوت میں پھنسے پھڑ پھڑاتے ہیں۔ وقت سے نجات نہیں اور فنا سے پناہ نہیں، پھر میں کیوں ہوں۔"(۱۵)

"یہ عبداللہ شاہ غازی کا مزار ہے، درگاہ کے در عقیدت مندوں کے لیے کھلے ہیں۔ ایک شخص صدیوں سے منوں مٹی کے نیچے سوتا ہے۔ وہ سوتا ہے اور اس کے ماننے والے جاگتے ہیں۔ جاگنے والوں کا نصیبہ سوتا ہے اور سونے والا ایسا بخت آور ہے کہ اس کے آستانے کی مٹی بھی لوگوں کی آنکھ کا سرمہ ہے۔"(۱۶)

ہجرت کا کرب فقط زاہدہ حنا کے افسانوں ہی میں سسکیاں لیتا محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان کی خاندانی زندگی بھی اس غم سے عبارت ہے۔ اگرچہ تقسیمِ ہند کے وقت وہ فقط سوا سال کی تھیں تاہم خاندان کے بزرگوں سے ان شہروں اور گھروں کے قصے سنتے سنتے بڑی ہوئی تھیں جہاں کی مٹی سے ان کا اور ان کے آباؤ اجداد کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ یہ اس مٹی ہی کی تاثیر تھی کہ اتنی دہائیاں گزر جانے کے باوجود اس شہر کی یاد ایک کسک بن کر ان افسانوں کے کرداروں کی صورت ہو کے بھرتی سنائی دیتی ہے اور وہ بلا اختیار یہ کہہ اٹھتی ہیں کہ گھر اینٹوں کی چار دیواری، چھت اور کمروں کا نام نہیں بل کہ گھر انسان کی روح میں بسی ہوئی ایک ایسی جگہ ہے جو دکھائی نہیں دیتی، اس سے میرا ایسا روحانی تعلق ہے جیسا کسی مرید کی روح کا تعلق مقاماتِ اقدس اور مزاروں سے قائم ہوتا ہے جنہیں انہوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہوتا۔ ان جگہوں کے ساتھ زاہدہ حنا کی گہری وابستگی اور اٹوٹ رشتہ ہجرت کی یاسیت میں ڈھل گیا ہے۔ ان کے ایک افسانے کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"فٹ پاتھ پر، ہر پیڑ کے نیچے مہاجرین کا بسیرا تھا، راتوں رات جھگیاں اگ رہی تھیں۔ ایک پیڑ کے سائے میں وہ بھی پڑ رہے۔(17)

"جب براستہ دلی واپس کراچی پہنچوں گی تو یہود و ہنود کی ایجنٹ قرار پاؤں گی"(18)

زاہدہ حنا کی کہانیوں میں ہمیں ایک طرف تو انسان اور زمین کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں تو دوسری طرف یہ کہانیاں زمان و مکاں کی حدود کی منکر ہیں۔ ان کے دکھ کسی ایک زمین، ایک خطے، ایک وطن کے دکھ نہیں بلکہ اس سیارے کے ہر خطے کا ہر دکھ ان کا اپنا دکھ ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، بغداد میں، ہائی پھونگ میں، افغانستان میں، چٹاگانگ میں،

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

ڈھاکہ میں، عراق میں، کراچی میں، قتل گاہوں میں، ٹارچر کیمپوں میں، نویں صدی میں، بیسویں صدی میں، 1965ء میں، ۱۹۷۱ء میں، ۱۹۷۹ء میں، ۱۹۸۰ء میں اور ۱۹۹۶ء میں زمان و مکاں کا کونسا المیہ ہے جو ہمیں ان کہانیوں، ان کے افسانوں میں نہ ملتا ہو۔ اگرچہ ادب کی دیگر اصناف کے علاوہ جدید افسانے کی صورت میں کئی ادیبوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور درجنوں زندہ رہنے والی افسانوی تخلیقات منظرِ عام پر آئی ہیں تاہم ان موضوعات پر زاہدہ حنا کے اثر انگیز افسانے ہماری نئی نسل کے لیے ایک قوی محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ پر اور کراچی کی بدامنی اور خرابی پر ان کے کئی افسانے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ "کراہ چی"، "یہ ہر سو رقص بسمل بود"، :معدوم ابن معدوم" مذکورہ بالا موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانے "منزل ہے کہاں تیری" کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "مسلم مسلم فساد۔۔۔۔ ڈھاکہ، چٹاگانگ، نواکھالی، کابل، قندھار، قاہرہ، تہران اور اب کراچی۔۔۔ عالیہ کی چھلکتی ہوئی آنکھوں میں کئی نام ابھرے اور ڈوب گئے۔ کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے، کتاب ملتِ بیضا پارہ پارہ تھی۔"(19)

حالاتِ حاضرہ اور حقوق انسانی جیسے پر زاہدہ حنا کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ انہوں نے جمہوریت اور اظہارِ رائے کی آزادی کو درپیش مشکلات اور طبقاتی امتیازات کے بارے میں سیاسی و سماجی شعور اور فکری پختگی کے ساتھ بے شمار اظہار کیے اور کہانیاں تحریر کی ہیں۔ عصری شعور اور عصری آشوب ان کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ وہ ایک عام فنکار کی طرح حوادثِ زمانہ سے فرار حاصل کرنے کی خاطر ماضی کی حسین یادوں میں پناہ گزیں نہیں ہوتیں۔ وہ ماضی کو عصرِ رواں کے ساتھ منسلک کر کے نہ صرف احوالِ زمانہ کو بیان کرتی ہیں بلکہ مستقبل کے امکانات واثرات پر سوالات اٹھا کر قاری کو عصری مسائل کی آگہی کا شعور دیتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور احمد:

> "اس میں شک نہیں کہ زاہدہ حنا باشعور قلم کاروں کی طرح ہمارے معاشرے میں ہونے والی بہت سی ناانصافیوں کے بارے میں نہ صرف معلومات رکھتی ہیں بلکہ باآواز بلند ان کا اظہار بھی مصلحت سوز ہوتا ہے۔"(20)

وہ دنیا کو تقسیم کرنے والی معاشی، سیاسی اور نسلی قوتوں سے نہ صرف واقفیت رکھتی ہیں بلکہ ان کی حکمت عملیوں کی بھی تفہیم رکھتی ہیں۔ وہ استحصالی طاقتوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور استحصال کا شکار ہونے والی انسانیت کی آواز بنتی ہیں۔ وہ محض مسلمانوں کی حالتِ زار پر اشک فشانی نہیں کرتیں بلکہ ان کی اس حالت کے ذمہ دار حکمران طبقے کو بڑی جرائت مندی کے ساتھ ہدفِ تنقید بھی بناتی ہیں۔ ذیل کا اقتباس دیکھیے:

> "ہر تیسرے چوتھے ہڑتال اور ہڑتال کے نتیجے میں بارہ اٹھارہ بیس بائیس لاشوں کا گرنا ایک معمول کی بات تھی۔ اخبار وحشت ناک خبروں اور خون آلودہ تصویروں سے بھرے ہوتے۔ ایک طرف سرکار تھی جس نے شہر کو بندوق کی نوک پر سر کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور دوسری طرف شہر تھا جسے دوسرے شکار کر رہے تھے اور جو خود کو شکار کر رہا تھا، اپنی ہڈیاں آپ چبا رہا تھا۔ دوسرے شہروں میں عیسائیوں پر سب دشتم کے مقدمے تھے، ہندوؤں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا اور احمدیوں کی مسجدوں میں تالے پڑ رہے تھے۔ ایک کڑور کی آبادی میں نو سو بہائی یوں رہتے تھے جیسے موجود ہی نہ ہوں، ان کے یہاں شیراز ہزد، تہران و تبریز سے رشتہ دار یا احباب آتے تو ان کے لبوں پر دل دہلا دینے والی کہانیاں ہوتیں۔ زاہدان کے رستے وہ کوئٹہ پہنچتے اور پھر چند دن وہاں دم لے کر کراچی کا رُخ کرتے۔ کراچی کے راستے یورپ و امریکہ کو جاتے تھے۔"(21)

زاہدہ حنا اذیت و عقوبت کی زد میں آئی کسی ایک نگری کو اپنی کہانی کا موضوع نہیں بناتیں، کسی ایک نسل، ایک قوم، ایک مذہب یا ایک فرقے کی پر آشوب داستان کو رقم نہیں کرتیں بلکہ وہ درد اور تفریق کی زد میں آنے والی تمام انسانیت، اپنوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے والے پاکستان، ایران اور بنگلہ دیش اور سپر پاور کی لگائی ہوئی آگ میں جھلستے عراق اور افغانستان کے ان گنت دکھوں کو صفحہ قرطاس کی نظر کرتی ہیں۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "یہاں کے بچے برسات میں نہا نہیں سکتے، کاغذ کی ناؤ بنا کر بہنے والے پانی میں چلا نہیں سکتے، اس لیے کہ برسات کا

HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

پانی بارودی سرنگوں کی جگہ بدل دیتا ہے۔"(22)

زاہدہ حنا اپنے قارئین سے درد کا نہیں درد کے شعور کا اشتراک کرتی ہیں۔وہ دکھ کو پرچم نہیں بناتیں اور نہ اسے محض دکھ رہنے دیتی ہیں۔ان کے یہاں الم ہے الم پسندی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا الم شعور کی گرفت میں ہوتا ہے،ان کے شعور کی تمام تر واردات تجربے اور مشاہدے پر قائم ہے۔وہ اپنے ارد گرد کی دنیا میں جن صداقتوں،مادی حقیقتوں،معاشی نظام کے ظالمانہ تضادات،بھوک وافلاس،انسانی رشتوں،عورتوں اور بچوں کی جس بے بسی و بے کسی کا مشاہدہ کرتی ہیں وہ وارداتِ قلبی کی صورت صفحہ قرطاس پر ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ان کی یہ تجربی ومشاہداتی وارداتیں بعض اوقات تضادات کا روپ دھار لیتی ہیں لیکن ایسے تضادات جو ان کے فکر وشعور کو درست جہت عطا کرتے ہیں۔ان کے فہم وادراک کو گہرائی بخشتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ جو طالبان کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں تو ان کی داخلیت کی تفہیم کا فریضہ بھی انجام دیتی نظر آتی ہیں:

> "اشتہاروں کے بعد ٹیلی وژن پر"زی نیوز" کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا ہے۔اسکرین دراز داڑھیوں اور سفاک چہروں سے بھرا ہوا ہے۔تسبیح کے دانے شمار کرنے والی انگلیاں گولے اور میزائل داغ رہی ہیں۔توپوں کی نالیں شعلے اگل رہی ہیں۔الجہاد۔۔الجہاد۔۔الامان۔۔الامان۔۔الامان۔۔الامان۔۔لوگ بھاگ رہے ہیں۔گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے،گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے آنکھوں میں ویرانیوں اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہوئے،شہر اور دیہات،کھیت اور باغات،بارودی سرنگوں سے اٹے ہوئے،پٹے ہوئے۔ہماری عظیم طاقتوں کی ایجاد سے پناہ کہیں نہیں،بچے باپ سے محروم،ماؤں سے بچھڑے ہوئے۔کسی کا ہاتھ ندارد،کسی کی ٹانگیں اڑی ہوئیں۔۔۔یہ جوئے خوں ہے،یہ جوئے خوں ہے۔چار برس سے ادھر اور ادھر دونوں طرف دعویٰ نفاذ اسلام کا۔دونوں اپنے مقتولین کو شہید کہنے پر مصر۔دونوں ایک دوسرے کے مقتولین جہنم واصل کرنے کی لذت سے سرشار۔قاتل بھی کلمہ گو،مقتول بھی۔دونوں کے صنم خاکی،دونوں کے صنم فانی۔اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟"(23)

زاہدہ حنا نے اپنے ایک افسانے "نیند کا زرد لباس" میں بے مہار امریکہ کی سفاکیت کے ساتھ ساتھ معصوم افغانی بچوں کی یاسیت اور ان کے دل میں مچلتے معصوم سوالات کو کس خوبصورتی سے رقم کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

> "آپ کے بھیجے ہوئے جہاز جب ہمارے لیے بسکٹ کے پیکٹ،مکھن کی ٹکیاں اور رنگ رنگ کی تتلیاں گرا رہے تھے تو میں اور میری کئی سہیلیاں ان تتلیوں کو اٹھانے کے لیے بھاگیں،بسکٹ کے پیکٹ اور مکھن کی ٹکیاں اٹھانے والے بچ گئے۔تتلیاں پکڑنے والی میری دو سہیلیوں کو تتلیاں اپنے ساتھ لے گئیں اور میری ایک ہتھیلی بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ہم نہیں جانتے تھے کہ امریکی بچے بارودی تتلیوں سے کھیلتے ہیں۔یہ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ یہ تتلیاں خاص طور سے ہمارے لیے بنی تھیں۔سنا ہے آپ جب اپنے بچوں کے لیے کھلونے بناتے ہیں تو ان کے ڈبوں پر ان سے کھیلنے والے بچوں کی عمر بھی لکھ دیتے ہیں لیکن آپ نے ہمارے لیے ایسے کھلونے کیوں بھجوائے تھے جو ہماری جان لے لیں،جو ان کی ہتھیلیاں اور ان کے پیر ساتھ لے جائیں؟"(24)

فوجی آمریت کے خلاف احتجاج جدید افسانہ نگاروں کے ہاں علامتی اور تجریدی صورتوں میں نظر آتا ہے۔اس صورتِ حال نے ادب کو ایک نئی جہت دی ہے اور ادب مجبور و بے بس عوام کی آواز بن گیا ہے۔زاہدہ حنا کے یہاں بھی ہمیں یہ جدید اور ترقی پسند سوچ اور اسلوب کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ان کے زیادہ تر افسانوں میں ملکی و بین الاقوامی فوجی آمریت کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ان کے افسانے "رنگ تمام خوں شدہ"،"تتلیاں ڈھونڈنے والی"،"جسم و زباں کی موت سے پہلے"،"آخری بوند کی خوشبو" اور "بود نبود کا آشوب" ان کی اس فکر کی روشن مثالیں ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

"منادی ہورہی ہے۔ گلی گلی گھر گھر۔" عورتیں گھروں میں رہیں گی۔ سڑک پر ان کا سایہ نظر نہ آئے۔ قدم باہر نکالنے والیوں کو شرعی سزائیں دی جائیں گی۔ عورتوں پر شیطان کا سایہ ہے سو انہیں گھر میں رکھو۔ کسی اخبار میں ان کی تصویر نہ چھپے۔ کسی اسکول یا مدرسے کی طرف ان کے قدم نہ اٹھیں۔ ٹانگیں توڑ دی جائینگی۔ پیر کاٹ دیے جائیں گے۔ بیواؤں کے گھروں میں فاقے ہوا کریں۔ بے باپ کے بچے لاچار ماؤں کی گودوں میں بھوکوں مریں۔ نفاذ شریعہ فاقے اور بھوک اور موت پر مقدم ہے۔"(25)

زاہدہ حنا کے افسانوں میں جابجا وقت کا تذکرہ ملتا ہے وہ وقت کی تجسیم چاہتی ہیں، اس کے خدوحال کھینچنا چاہتی ہیں لیکن اس کی فراخی، وسعت، ازلیت اور ابدیت کے سامنے بے بس ہو جاتی ہیں۔ وہ وقت کا تصور قائم کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کی گویائی وقت کے نقش و نگار بیان کرنے سے اور بینائی اس کے دیدار سے قاصر ہے۔ وہ وقت کی بساط کو فتح کرنا چاہتی ہیں۔ اس کے کھیل کی تفہیم چاہتی ہیں مگر اس کی لہروں کے رنگ اور اس کے حریف کو دیکھ نہیں پاتیں۔ وہ وقت کی ہار اور جیت کا ادراک نہیں کر پاتیں کہ کیسے یہ کبھی جیت جاتا ہے اور کبھی آن کی آن میں مات دے دیتا ہے۔ وہ وقت کی محدودیت اور لامحدودیت، اس کی گردش کو پالینا چاہتی ہیں۔ مگر اِک سفرِ ناتمام کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ "صرصرِ بے اماں کے ساتھ" میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

"وقت لا محدود ہے اور اس کے ساتھ ہی محدود بھی کیونکہ وہ کائنات کی مانند ایک دائرہ ہے جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وقت کو خطِ مستقیم میں سفر کرنے والی غیر محسوس اور نامعلوم شے سمجھتے ہیں اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وقت گردش میں ہے اور اس گردش نے ایک دائرے کو جنم دیا ہے اور دائرہ جب مکمل ہو جاتا ہے تو پھر اس کے بارے میں کون بتا سکتا ہے کہ اس کا نقطہء آغاز کہاں ہے اور نقطہء انجام کہاں۔ وقت بھی کبھی نہیں گزرتا ہمیشہ لوٹ آتا ہے۔۔ بس یوں ہے کہ وقت گردش میں ہے اور ہم سب اس گردش کا ایک حصّہ ہیں۔ وقت کائنات کے دائرے میں گردش کرنے والی دھول ہے جو ہمارے سروں پر جمتی ہے تو بڑھاپا بن جاتی ہے اور ہمارے بدن سے لپٹتی ہے تو ہم مٹی میں مل جاتے ہیں۔ وقت خاک اور باد ہے، وقت خدا ہے اور کائنات ہے، وقت سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔"(26)

ہمارے نئے افسانہ نگاروں نے علامت اور استعاروں کی نہ صرف ضرورت محسوس کی ہے بلکہ اسے اپنی تحریروں کا حصّہ بنا کر اردو ادب میں علامتی افسانوں کی مضبوط بنیاد رکھی ہے۔ زاہدہ حنا نے بھی اپنے افسانوں میں علامت نگاری کو برتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج سے چالیس سال پہلے کی سیدھی سادی کہانیوں کا طور اپنی استعالی قدر کھو چکا ہے وہ طور ان پیچیدہ مسائل کے اظہار کا اہل نہیں ہے جس سے آج کا ذہن دوچار ہے۔ انہیں پیچیدہ مسائل کے بیان کے لیے علامتی افسانہ کی ضرورت کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانے "آنکھوں کے دیدبان" سے ان کی علامت نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

"مجھے کائنات کی قلمرو نہیں چاہیے۔ میں منتظر آنکھوں والی ہوں اور مجھے سمندر کا انتظار ہے۔ لیکن وہ مجھ تک نہیں آتا۔ وہ اپنی کہنیوں کے بل اٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور پھر تھک کر لیٹ جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اٹھوں اور اس کی طرف سفر کروں لیکن جب میں اس کی طرف چلنا چاہتی ہوں تو میرے پیر نہیں اٹھتے اور تب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا انچلا دھڑ گرد باد کا ہے اور مجھے شفاف دیواروں والے اس حصار میں مقید کر دیا گیا ہے۔ باہر دروازے پر میری سیاہ آنکھیں پہرا دیتی ہیں اور ان کی چمک میرے اعصاب کو جیسے سلا دیتی ہے، تب میں سوچتی ہوں مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے جب سمندر کی تھکن اتر جائے اور وہ میرے پاس چلا آئے۔"(27)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

زاہدہ حنا کے افسانوں کے موضوعات میں وجودی مباحث بھی شامل ہیں جن کا ادراک مہاجرت اور اس کے ناسٹیلجیا کے تناظر میں کیا جا سکتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقوعے کے نتیجے میں تاریخ، جغرافیہ، زبان، رہن سہن کی تقسیم، سیاسی، معاشی، سماجی، تعلیمی بحران، جاگیر دارانہ نظام انگریزی بولنے والوں کی بالادستی، تعلیمی نظام پر مغربیت کے سائے، صنعتی پسماندگی، روزگار کی عدم دستیابی اور فقیہِ شہر کی منافقتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ان حالات میں شاعروں اور ادیبوں نے اپنے باطنی جذبات اور بے وقعتی و ناقدری کے احساسات کے اظہار کے لیے وجودی خیالات وافکار کو وسیلہ بنایا ہے۔ زاہدہ حنا کی کہانیوں میں بھی وجودی بے بسی اور بے حیثیتی، انسانی زندگی اور کائنات کے بے معنویت، ہجرت کی سیاسیت، دہشت، خوف، اضطراب، تشویش، ہستی، فنا، عدمیت، داخلیت وغیرہ جیسے تصورات بکثرت ملتے ہیں۔ ان کا افسانہ "آنکھوں کے دیدبان" وجودیت کی ایک عمدہ مثال ہے:

> "وجود کی شہر پناہ پر آنکھوں کے دیدبان پیرا دیتے ہیں لیکن جب سحر ہو گی اور شہر پناہ میں بنے ہوئے دروازے کھول دیے جائیں گے اور قلعہ ذات پر نگہبانی کے لیے مامور انا کا دیوتا اونگھ جائے گا تو وجود کہاں پناہ چاہے گا؟"(28)

مرزا حامد بیگ، زاہدہ حنا کے فلسفہ وجودیت پر یوں رقم طراز ہیں:

> "آج کی انٹلکچوئل عورت کے نزدیک وصال ایک شفاف ندی ہے۔ جس کے اندر کوئی رمز نہیں اور اس کے مقابل فراق جان لیوا ہے۔ لیکن اسرار سے پُر سمندر کی مانند خوبصورت، یوں ان کا چناؤ فراق ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانوں میں وجودیت کے فلسفے کے زیر اثر ہمارے عہد کی مغربی انسانی جدوجہد کی خاص معنویت ہے اور وجودی سطح پر عورت اور مرد کا ازلی تنازع توجہ کا طالب۔"(29)

مجموعی طور پر زاہدہ حنا کے افسانے اپنے اندر ایک قسم کی وحدت رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات ایک دوسرے سے منسلک نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ذاتی کرب کو اجتماعیت کے آئینے میں دکھایا ہے۔ ان کی کہانیاں محض کہانیاں نہیں ہیں بلکہ عصری صورتِ حال کی اہم دستاویز ہیں۔ وہ اپنے عہد کو نفسا نفسی، حرص وہوا، سماجی ناہمواری، سیاسی انحطاط، جنگ وجدل کی ہولناکیوں، لادینیت، اضطراب اور بے زمینی کے عذاب سے نکالنا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ جو کرب انہوں نے جھیلا ہے آنے والی نسلیں اس سے آزاد رہیں۔

حوالہ جات

1۔ زاہدہ حنا کے ساتھ گفتگو (انٹرویو)، ثمینہ، شخصیت (پروگرام)، راجھے سہاٹی وی، 19 مارچ 2016

2۔ زاہدہ حنا، "قیدی سانس لیتا ہے"، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱

3۔ ایضاً، ص ۱۱

4۔ ایضاً، ص: ۱۵

5۔ ایضاً، ص: ۱۸، ۱۷

6۔ ایضاً، ص: ۱۶

7۔ زاہدہ حنا، "راہ میں اجل ہے" مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص: 27

8۔ ایضاً، ص: ۲۷

9۔ ایضاً، ص: 29

10۔ زاہدہ حنا، "قیدی سانس لیتا ہے" دانیال پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص: ۳۳۸، ۳۳۷

11۔ایضاً،ص:۴۶

12۔ایضاً،ص:۳۱،۳۲

13۔ایضاً،ص:۷۷

14۔ایضاً،ص:۸۷

15۔زاہدہ حنا،"قیدی سانس لیتا ہے"،ص:۶۲

16۔ایضاً،ص:71

17۔زاہدہ حنا،"رقصِ بسمل"،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۱،ص:۵۸

18۔ایضاً،ص:۷۸

19۔ایضاً:(64،65)

20۔انوار احمد،ڈاکٹر،"اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ"،ص:۶۶۸

21۔زاہدہ حنا،"رقصِ بسمل"،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۱،ص:۱۱۲،۱۱

22۔ایضاً،ص:۱۵۶۱

23۔ایضاً،ص:۸۸

24۔ایضاً،ص:۲۱۴

25۔ایضاً،ص:۸۹

26۔زاہدہ حنا،"قیدی سانس لیتا ہے"،ص:۸۸

27۔ایضاً،ص:۹۰

28۔ایضاً،ص:۹۰

29۔مرزا حامد بیگ،نسوانی آوازیں،سارنگ پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۶ء،ص:۲۱۴